علی گڑھ ڈائسپورہ - ۱۵

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدسالہ جشن کے فِنالے (دسمبر۲۰۲۱) کی تقریب سے شروعات

# انگریزی راج کا سب سے بڑا باغی: سرسید

**- سرسید کی کچھ بھولی بسری تحریروں کی پیشکش: انتخاب از پروفیسر سید ابوالخیر کشفی مرحوم**

## الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

بعض اخبار ناقل ہیں کہ پونا کی میونسپل کمیٹی پر ایک **صاحب یوروپین** نے چالیس ہزار روپیہ کا دعویٰ اس ہرجہ کی بابت کیا جو ان کی ایک ٹانگ کے ٹوٹ جانے سے ہوا جس کی کیفیت یہ ہے کہ پونا کی حدود میونسپلٹی کے اندر ایک سڑک کے کنارے اینٹوں کی سرخی کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ **صاحب بہادر** جو بگھی دوڑاتے ہوئے اس طرف سے نکلے تو بگھی کا پہیہ اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ گیا جس کے صدمہ سے بگھی الٹ گئی اور صاحب گر گئے اور ان کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا۔ صاحب موصوف نے اس الزام میں میونسپل کمیٹی پر نالش کر کے سولہ ہزار روپیہ کی ڈگری حاصل کی۔ پس یہ ایک عجیب وغریب مقدمہ ہے جس کو سن کر ہم کو تعجب ہوتا ہے اور اس قاعدے کے بموجب بہت سی مشکلیں پیش آتی معلوم ہوتی ہیں، کیوں کہ اگر اسی طرح کبھی صاحب ممدوح کی بگھی راہ میں کسی شخص کے مکان کی دیوار سے ٹکر کھاتی تو صاحبِ ممدوح صاحبِ مکان پر ٹانگ ٹوٹنے کا دعویٰ کر کے سولہ ہزار کی ڈگری حاصل کرتے، اور اگر آئندہ راہ میں ان کی بگھی کی جھپٹ میں کوئی آدمی آجاوے گا اور صاحب کا گھوڑا اس کے سبب سے چونک جاوے گا اور صاحب گر کر ہاتھ پاؤں توڑ لیں گے تو اس غریب پر نالش کر کے ہرجہ وصول کریں گے اور وہ غریب جھپٹ میں مر گیا تو صاحب اس کے ورثاء پر ہرجہ کی نالش فرماویں گے۔

ہم کو حیرانی ہے کہ میونسپل کمیٹی پر یہ دعویٰ کیوں کیا گیا اور صاحب جج نے یہ دعویٰ کیوں سن لیا کیوں کہ دراصل صاحب ممدوح اگر نالش کر سکتے تھے تو اپنی آنکھوں پر کر سکتے تھے جن کو یہ نہ سوجھا کہ ہم اندھا دھند بگھی کو کہاں لئے جاتے ہیں اور اینٹوں کے ڈھیر پر کیوں چڑھاتے ہیں، اور سڑک چھوڑ کر اس کنارے پر کیوں بگھی بھگاتے ہیں اور اگر ان کی آنکھیں یہ عذر کریں کہ ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم تو صاحب بہادر کی عقل کے ماتحت ہیں، جو کچھ مواخذہ ہونا چاہئے، صاحب بہادر کی عقل سے ہونا چاہئے، تو یہ عذر بھی قابل سماعت ہوگا اور اس کے سبب سے صاحب بہادر کی عقل بھی مدعا علیہ قرار پاوے گی۔ لیکن اس عذر سے صاحب کی آنکھوں کی بالکل براءت نہیں ہوسکتی کیوں کہ جرم قتل یا ضرررسانی میں کسی نوکر کا یہ عذر کہ مجھ کو میرے آقا نے فلاں شخص کی نسبت حکم قتل دیا تھا اس لئے میں نے اس کو مار دیا، نوکر کو جرم قتل سے بری نہیں کرتا۔ مگر ہاں البتہ بعد ثبوت کے آقا بھی ماخوذ ہوسکتا ہے۔ پس نظر بریں صاحب موصوف کی آنکھیں اور عقل دونوں مدعا علیہ ہوسکتی ہیں۔

ہم کو یہ بات ظاہر کرنی چاہئے کہ کسی موقع پر بہ ضرورت ملبہ کا اکٹھا ہونا کچھ میونسپل کمیٹی کے حق میں جرم نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ جرم سمجھا جاوے تو میونسپل کمیٹی کوئی کام اپنا نہیں کرسکتی۔

(اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۵ر ستمبر ۱۸۷۶ء)

●

## ہندستانیوں کے خون کی ارزانی

جو تنبیہ حضور لارڈ لٹن صاحب بہادر نے مسٹر فلر کے مقدمہ میں فرمائی اس کے بعد سے بجائے اس کے کہ ہمارے کان میں یہ صدا کم پہنچتی کہ فلاں **صاحب** کے ہاتھ سے فلاں ہندستانی 'مارا گیا' برابر ہمارے کان میں یہ آواز پہنچتی رہی کہ آج ایک اور ہندستانی کو فلاں یوروپین نے ہلاک کردیا اور یہ خبریں ہم کو اسی طرح پہنچتی ہیں، جس طرح شکار کے موسم میں یہ خبریں پہنچتی ہیں کہ ایک **صاحب** نے ایک ہرن یہاں سے مارا، دوسرے صاحب نے ایک ہرن وہاں سے مارا۔ چنانچہ **فلر صاحب** کے مقدمہ کے بعد ایک خبر **توپ خانہ کے صاحب** کی پہنچی، جنہوں نے ایک پنکھا قلی کو مارے لاتوں کے جان سے ڈالا۔ دوسری خبر **ان صاحب** کی پہنچی جنہوں نے ایک ملاح کو راہ گزائے عالم بقا کیا۔ تیسری خبر لکھنؤ کے چوکی دار کی پہنچی جس کو **شوقین گوروں** نے بندوق سے شکار کیا۔ چوتھی خبر کراچی کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محکمہ ٹیلیگراف کی پہنچی، جنہوں نے ایک شخص کو مار ڈالا۔ پانچویں خبر گورکھ پور کے ایک **تماشہ والا صاحب** کی پہنچی، جنھوں نے ایک شخص کو سرائے میں لٹھ مار کر ہلاک کیا۔ چھٹی خبر جہلم کے ایک **صاحب ایلچی نامی** کی ہے جو ملازم ریلوے ہیں اور انھوں نے ایک پنکھا قلی کے سر میں ایک ضرب شدید پہنچا کر اس کو ہلاک کیا۔ غرض کہ یہ چھ خبریں قتل کی ہیں جن میں **چھ غریب ہندستانی مقتول اور چھ صاحب بہادر قاتل ہیں** اور جملہ مقدمات میں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ قاتلوں سے کیا مواخذہ ہوا۔

ہم کو ان تمام دردناک خبروں کے سننے سے نہایت افسوس ہوا ہے۔ اور وہ افسوس کچھ صرف اسی وجہ سے نہیں ہے کہ بے چارے غریب ہندستانی ایسی بے رحمی کے ساتھ مارے گئے اور ان کا خون ایک جانور کے خون بلکہ پانی سے بھی زیادہ بے قدری کے ساتھ بہایا گیا اور باوجود اس کے ہندستانیوں کی فریاد کی کچھ شنوائی نہیں ہے۔ **بلکہ** بڑا سبب افسوس کا یہ ہوا کہ ہندستان میں جس طرح ہندستانیوں کی فریاد شنوائی کے لائق نہیں ہے اسی طرح شاید ہمارے حضور گورنر جنرل بہادر کے احکام کی بھی شنوائی نہیں ہوتی کیوں کہ اگر ان کی شنوائی ہوتی تو اس کا اثر یہ ہوتا کہ ہمیشہ کے واسطے نہیں تو چند روز کے واسطے تو ضرور ہندستانیوں کو اس سختی سے نجات ملتی اور کچھ تو ہمارے ملک کے حاکم متنبہ ہوتے، نہ کہ برخلاف اس کے برابر قتل ہو رہا ہے اور کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ کیا کسی کے نزدیک یہ امر کچھ انصاف سے بعید نہیں ہے کہ **انگریزی عمل داری میں انسان جانوروں کی طرح مارے جاتے ہیں**۔ کیا یہ وہی فعل نہیں ہے جس کے سبب سے مشرقی سلطنتیں آج تک ظالم مشہور ہیں اور ان کی بدنامی حد سے زیادہ گزر گئی ہے۔ کیا ان کی نسبت یہی نہیں کہا جاتا تھا کہ ان کے عہد میں رعایا کی جان و مال کی حفاظت نہ تھی۔ ان کے جیل خانے خراب تھے۔ ان کے کارپرداز خودغرض اور ظالم تھے۔ **پس کیا اے انصاف پسند لوگو! اب انگریزی عمل داری کو یہ حرکتیں** بدنام نہیں کریں گی۔ کیا غریب ہندستانی اسی طرح کام میں آویں گے کہ ہمیشہ صاحب لوگوں کے گھونسوں اور لاتوں اور

رولوں سے پٹ کر جان دیں گے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر گورنمنٹ انگریزی میں جان کی حفاظت کا دعویٰ شاید صحیح نہ ہوگا۔ سلاطین مشرقیہ کے زمان میں جو حفاظت جان کی نہ تھی اس کے کچھ یہ معنی نہ تھے کہ سلاطین اپنے ہاتھ سے ہمیشہ لوگوں کو قتل کرڈالتے ہوں یا علی الصباح بطور تماشا دو چار کو قتل کا حکم دے دیتے ہوں، بلکہ ان کے عہد میں بعض ظلم پسند ایسی حرکات کا باعث ہوتے تھے، اور جب ان سے کچھ باز پرس نہ ہوتی تھیں، تو ان کی جرأت بڑھتی تھی۔ اسی طرح اب یہ کیفیت ہے کہ غریب ہندستانی برابر مارے جاتے ہیں اور قاتلوں کو چنداں عبرت نہیں ہوتی جس سے خود وہی آئندہ کو باز آویں یا ان کو دیکھ کر اور کسی کو عبرت ہو۔ بلکہ جس وقت حضور لارڈ لٹن صاحب بہادر کی تنبیہ کی نسبت ہائی کورٹ نے اعتراض کیا ہے اس وقت سے یہ بھی امید نہیں ہے کہ کچھ باز پرس ہوگی کیوں کہ ضلع کے حکام اور ڈاکٹر ضرور مقتول کو طحال کا مریض سمجھیں گے اور اس کی موت مرگِ اتفاقیہ میں شامل ہوا کرے گی اور اگر کوئی گورنر جنرل بھی اس باب میں دخل دے گا تو ہائی کورٹ کی ناخوشی ہوگی اور اس گورنر جنرل کی کارروائی خلاف ضابطہ قرار پاوے گی۔ جس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوگا کہ بہر کیف تمام امور خلاف ضابطہ ہیں۔ صرف مقتول کا مرجانا ایک باضابطہ کارروائی ہے۔ پس ایسے موقع پر ہماری دانست میں اگر اس بناء پر کارروائی ہوا کرے تو نہایت آسانی ہے کہ ایسے مقتول کی نسبت صرف موتِ تقدیری کا حکم دیا جایا کرے۔ اور یہ لکھا جاوے کہ گو اس کو صاحب نے مارا مگر جب تک کہ اس کی تقدیر میں موت نہ تھی وہ کیوں مرگیا۔ نظر بریں اس کی موت کا سبب صرف اثر تقدیر ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اس صورت میں نہایت بھاری الزام قانونی سے چنداں سروکار نہ رہے گا۔

قانونِ تعزیرات ہند کے اس حکم سے کہ اشتعال طبع کی حالت میں قتل عمد نہیں رہتا اور اگر آلہ قتل سے قتل نہ کرے تو قتل عمد نہیں ہوتا' یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ بے رحم لوگ نہایت جری ہوگئے تھے اور ہر شخص اپنے دل کے غبار نکالنے اور قتل میں کامیاب ہونے کے واسطے اشتعال طبع کا حیلہ پکڑنے لگا تھا۔ مگر تاہم کچھ اندیشہ تھا اور جب سے کہ شاہ جہاں پور میں ایک **گورے کے ہاتھ سے تین ہندستانی** مقتول ہوئے اس وقت سے آلہ قتل کی بھی چنداں پروانہ رہی اور لکھنؤ میں آج کل ایک چوکیدار کا شکار بندوق سے ہوا ہے اور اگر آئندہ ایسے امور میں ڈاکٹروں اور جیوریوں کی نیت بخیر رہی تو پھر مقتول کے مریض ہونے اور قاتل کے نشہ باز ہونے سے بڑی گنجائش ہوگی اور ہندوستانیوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔

اگر ان چھ وارداتوں کے ساتھ شاہ جہاں پور کے تین خون اور فلر صاحب کے سائیس کا خون بھی شامل کرلیا جائے تو یہ دس خون ہوتے ہیں جو بہت تھوڑے عرصہ میں واقع ہو چکے ہیں۔ پس اگر گورنمنٹ انگریزی اپنی توجہ اس طرح مائل نہ کرے گی تو اس کے نوجوان ولایت زاد حاکم جو ابھی ہندستان میں آئے ہیں ہندستانیوں کے قتل میں ایسے ہی بے باک ہوجاویں گے جیسے اب وہ شکار پر بے باک ہیں اور اس وجہ سے ہندستانی رعایا کے دل میں ان کی طرف سے ایک ہولناک اندیشہ پیدا ہو جاوے گا اور اس کا نتیجہ تدبیر مملکت کے بالکل برخلاف ہوگا۔

(اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۵/ستمبر ۱۸۷۶ء)

●

## جوتے کا مقدمہ

جو لوگ وقت کی مصلحت اور زمانہ کی ضرورت سے بے خبر ہیں اور جن کی نظر میں قومی عزت کوئی شے نہیں ہے اور جن کو قومی ذلت سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا، شاید وہ اس خبر کو سن کر بھی بے خبر رہے ہوں گے کہ سر اجلاس (عدالت) ایک نوجوان اسسٹنٹ الہ آباد نے ایک **ہندستانی** مختار کا جوتا اتروا کر اس کے سر پر رکھوایا اور چند منٹ تک اس کو اسی طرح کھڑا رکھا۔ چونکہ وہ ایک ہندستانی تھا اور اس کی عزت و بے عزتی کا اثر تمام قوم پر ہوتا ہے اس وجہ سے دور اندیش لوگوں کو اس خبر کے سننے سے نہایت ہی افسوس ہوا ہوگا۔ وہ زبان دراز لوگ جن کے دماغ میں عقل کا جوہر بہت کم رکھا گیا ہے جوتے کے معاملہ کو ایک خفیف بات کہتے، اور اس کے متعلق بحث و حجت کو مضحکہ بتاتے، اگر وہ اس خبر کو سن کر بھی اسی غلطی میں پڑے رہیں تو بلاشبہہ ان کی بے پروائی نہایت افسوس کے لائق ہوگی۔ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی قوم کے ایک شخص کے سر پر برسر عدالت جوتا رکھوایا جانا ان کے حق میں کس قدر ذلت کا باعث ہے اور قومی عزت میں نقصان آنا کس نتیجہ کا موجب ہے۔ کیا اب وہ اس بات سے خوش ہوں گے ک ان ہی کی جوتی ان ہی کا سر ہو؟

جس تیز مزاج افسر نے اپنی دانست میں اس حرکت کو اپنی حکومت کی شان سمجھا' ہماری دانست میں وہ اپنی ہم قوم گورنمنٹ کے عدل و انصاف کا حامی نہیں ہے اور شاید وہ اپنی اس تیز مزاجی کے سبب سے گورنمنٹ کے نامور ملازموں میں شمار نہ ہوسکے گا۔ اس افسر نے شاید اپنے نزدیک ہندستان میں اپنی عدالت کو انتہائی عدالت خیال کیا جس کی داد نہ فریاد۔ ورنہ کوئی ضابطۂ انصاف اس کارروائی کو منصفانہ نہیں کہہ سکتا۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ جب کبھی رعایا میں سے کوئی شخص کسی ایسی حرکت کا مرتکب ہوتا ہے جو قانوناً جرم قرار دی جاتی ہے تو کبھی اس کے لئے اس قسم کی زیادتی بھی محرک ہو جاتی ہے۔ اور اس بات کے خیال کرنے سے کہ جب افسران عدالت ہی انصاف نہیں کرتے تو ہم کو اپنا انصاف آپ کرلینا چاہئے' نہایت آزردہ ہوکر لوگ ایسی کارروائی کرتے ہیں۔

ہندستان میں اعلیٰ درجہ کی عدالت جو اسی وجہ سے عدالت العالیہ کہلاتی ہے ہائی کورٹ ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے نزدیک ہندستانیوں کا جوتا پہن کر آنا جانا کچھ خلاف آداب عدالت نہیں ثابت ہوا بلکہ وہاں علی العموم تمام وکلاء اور اہل مقدمہ اجلاس کے کمروں میں بھی جوتا پہن کر جاتے ہیں اور حکام عدالت ہرگز اس پر تعرض نہیں کرتے۔ پس افسوس ہے کہ یہ نوجوان اسٹنٹ کیوں اس کو خلاف آداب عدالت سمجھے۔ کیا ان کی عدالت کے آداب عدالت ہائی کورٹ کے آداب سے کسی وجہ سے کچھ زیادہ ہیں۔ یا ان کی عدالت کے واسطے کوئی خاص عزت ہائی کورٹ کی عزت سے اعلیٰ ہے جس کے سبب سے وہ ایسی زیادتی پر آمادہ ہوئے؟

ہائی کورٹ کی وہ تمام کارروائیاں جن کو وہ خود کرتی ہے یا جن کو جائز رکھتی ہے، وہ عدالتوں کے واسطے قانون سمجھی جاتی ہیں، پس ہم کو حیرت ہے کہ جس عدالت کی کارروائیاں انفصال خصومات میں قانون سمجھی جاتی ہیں اس عدالت کی کار روائی آداب عدالت کے باب میں کیوں نہیں واجب الاتباع سمجھی جاتی۔

جوتا پہن کر عدالت کے کسی کمرہ میں جانا خلاف آداب ہی قرار پاوے تو جوتا پہن کر جانے والا صرف اس سزا کا مستوجب ہوگا جو قانون کے منشاء کے موافق اس شخص کے واسطے مقرر ہے جو عدالت کی عزت میں خلل انداز ہوا اور ہم کو یقین ہے کہ ایسے مجرم کے واسطے کسی قانون میں یہ سزا نہیں ہے کہ مجرم کے سر پر پندرہ منٹ تک جوتیاں رکھوائی جائیں یا جو شخص ذرا بھی اپنے مطلب کی تائید کے واسطے زیادہ گفتگو کرے تو نازک دماغ حاکم اس کے کان پکڑوائے اور اٹھاوے بٹھاوے یا اس کو ڈیم سور کہہ کر سر اجلاس دو لاتیں لگاوے یا راہ چلتے شخص کو اس جرم میں پکڑ کر بید لگوادے کہ اس نے ہم کو سلام نہیں کیا تھا۔ ایسی سزاؤں کا اپنی طرف سے جاری کرنا جن کے وہ قانوناً مجاز نہیں ہیں انگریزی عدالتوں کی تہذیب اور انصاف میں سراسر بٹہ لگاتا ہے۔

ہم عدالت ہائی کورٹ کے انصاف اور تہذیب کے نہایت مداح ہیں کہ وہ اپنی غریب رعایا کے ساتھ منصفانہ برتاؤ میں اپنے فرض کو ادا کرتی ہے، مگر اسی قدر ہم کو اس کی نسبت بھی خیال ہے کہ اس کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اپنی

عدالت کو انصاف کا ذمہ دار سمجھ لے اور جو عدالتیں اس کی ماتحت ہیں ان کی پروانہ کرے۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ خود عدالت العالیہ اور تمام عدالتوں کے انصاف کا مرجع ہے یہ بھی اس کا فرض ہے۔

(اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۷/مارچ ۱۸۷۶ء)

●

## کلکتہ میں صاحب بہادر کا حلال خور سے مقدمہ

( کلکتہ میں ایک مہتر )، صاحب کے یہاں کلکتہ میں نوکر تھا۔ صاحب سے اور اس سے تکرار ہوئی تو صاحب نے اس پر نالش کی مگر مقدمہ خارج ہو گیا۔ ہم کو افسوس ہے کہ صاحب نے ایسے خفیف مقدمہ میں کیوں نالش کی اور کیوں مہتر کے برابر کھڑے ہو کر مدعی ہوئے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ وہ خوب جانتے تھے کہ جو بیان انھوں نے عدالت میں کیا وہ چنداں لائق لحاظ نہ تھا۔ کیا عدالت اس بات کا یقین کر سکتی ہے کہ صاحب بہادر نے مہتر کو صرف برتن دھونے کا حکم دیا ہو اور مہتر نے بجواب اس کے حملہ کیا ہو۔ ایک ''ادنیٰ ملازم بھلا یہ جرأت کر سکتا ہے کہ اپنے آقا کا وہی کام نہ کرے جس کا وہ نوکر ہو اور کام کے مقابلہ میں حملہ کرے۔ کیا کسی کو یہ یقین آ سکتا ہے کہ صاحب ایسے حلیم الطبع ہوں کہ اس کی گستاخی پر کچھ ہاتھ پیر نہ ہلا دیں۔ بلاشبہ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب صاحب نے نہایت خفیف قصور پر اسکو زیادہ سخت پکڑا ہوگا اور مار پیٹ کی ہوگی تو مہتر نے لاچار ہو کر، اور مسٹر فلر کے سائیس کو یاد کر کے یہ خیال کیا ہوگا کہ اگر میں بیٹھا رہا تو مفت جان جاوے گی' اس لئے اس نے اپنی جان بچانے کے واسطے گستاخی کی ہوگی۔ ہمارے قول کی تصدیق سعدی کے اس شعر سے ہوتی ہے:

وقت ضرورت چو نماند گریز
دست بگیرد سر شمشیر تیز

اب ہم ذیل میں اس خبر کو لکھتے ہیں:

''مسٹر بروز صاحب ساکن کروکوڈلین کلکتہ نے اپنے مہتر پر حملہ آوری کی نالش کی جو ۲۵ ماہ گذشتہ کو واقع ہوا۔ صاحب موصوف نے اس کو ایک قلعی کا برتن صاف کرنے کا حکم دیا تھا لیکن اس نے صاحب کی مرضی کے موافق برتن کو صاف نہیں کیا۔ صاحب نے کہا پھر صاف کرو جس پر مدعا علیہ گستاخی سے پیش آیا اور جب صاحب بہادر نے کھڑے ہو کر اس سے کہا کہ تو مکان سے نکل جا تو مہتر نے لوٹا کھینچ مارا جس سے صاحب کی ٹھوڑی پر گہرا زخم آیا۔ مدعی کا اظہار تو یہ تھا ۔لیکن گواہی سے ثابت ہوا کہ طرفین سے حملہ کی نوبت پہنچی تھی۔ اس وجہ سے صاحب مجسٹریٹ نے مقدمہ خارج کیا۔

(اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۵/ستمبر ۱۸۷۶ء)

☆☆☆

# سید ابوالخیر کشفی کے بارے میں

سید ابوالخیر کشفی کا نام برصغیر کے اس ہمارے والے زمین کے ٹکڑے، کانپور، میں ایک نسبتاً کم معروف نام رہا۔ اور یہ بات تو اور بھی کم جانی گئی کہ اس نام کے کراچی میں بیٹھے ہوئے ایک شریف پروفیسر کو سید والا گھر سے ایسا گہرا دلی تعلق تھا جس نے ان سے سید کی تحریروں کا ایسا خوبصورت انتخاب کرا دیا۔

کشفی صاحب نے سرسید کی ایسی بے مثال تحریریں ڈھونڈ نکالی ہیں جو پوری ایک صدی تک بینام رہیں ۔ باغی سرسید کے ساتھ بے انصافی ہوتی رہی اور یہ بے انصافی اس مصنف مفکر اور معلم کے ساتھ ہوتی رہی جس نے اسبابِ بغاوتِ ہند جیسی سرکش کتاب لکھی تھی۔ یہ تحریریں جو اسبابِ بغاوت کے سترہ اٹھارہ سال بعد لکھی گئیں، اسی بہادر، جری قلم سے نکل سکتی تھیں۔

بحیثیت ادیب کے اردو دنیا میں جانے پہچانے ہونے کے باوجود، سید ابوالخیر کشفی مرحوم، سرسید کے واسطے سے لوگوں میں کم ہی معروف ہیں۔ کچھ یہ بات بھی رہی کہ سینتالیس کے بعد جب اردو اور اردو والے بھی دو ملکوں میں تقسیم ہو گئے، کشفی صاحب اپنے سارے خاندان کو کانپور میں خیر باد کہہ کر کراچی جا بسے تو شروع شروع میں تو پاکستانی اردو کے اکابر کی تحریریں ہندستان میں اسمگل ہو جاتی تھیں مگر کشفی صاحب کے قلم میں جان آتے آتے ہندستان والے بالکل محروم ہوتے گئے۔ اب کشفی صاحب کو ایک دو کے سوا شاید ہی کوئی یاد رکھتا ہو، بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب ڈاکٹر صغیر افراہیم صاحب کی ایک تحریر میں کشفی صاحب کا نام دیکھا جنہوں نے بڑے پیار سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ کچھ اچھا تو لگا مگر کچھ حسد بھی ہوا کہ انہیں یاد کرنے والوں میں ہم سے وہ فخر چھن گیا کہ اب ہندستان میں ہم ہی انہیں جانتے اور مانتے ہیں۔ ویسے کیا معلوم ان کو اور بھی کتنے عقیدت و محبت سے یاد رکھنے والے موجود ہوں۔

کشفی صاحب کے انتخاباتِ سرسید سے یہ عجیب و غریب منتخبات آپ نے ملاحظہ فرمائے، اور جن پر پچھلی ایک صدی بھر کشفی صاحب کے سوا کسی کی نظر نہیں پڑی اور جو سرسید کے 'گزٹ' میں ۱۸۷۶ء اور اس کے آس پاس میں چھپے تھے، جب سنہ ۵۷ کی قیامت کو ابھی بیس برس بھی نہیں گزرے تھے۔

کشفی صاحب، نامور استاد شاعر اور کانپور کی مشہور خانقاہ کے اکبر الا کابر حضرت ثاقب کانپوری کے سب سے بڑے فرزند تھے جو بعداً کراچی یونیورسٹی کے مشہور پروفیسروں میں شمار ہوئے۔ کئی درجن کتابوں کے مصنف اور صاحب طرز نثر نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہندو پاک کے اردو دانشوروں کی اس مختصر ترین گنتی میں شامل ہیں جن کی تعداد دس سے آگے نہیں بڑھتی۔

مرحوم ابوالخیر کشفی نے لکھا تھا: برطانوی حکومت کی نوکر شاہی کے بارے میں سرسید کی تیز و تند طنزیہ تحریروں سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اگر اسباب بغاوت ہند میں، سرسید نے کمپنی بہادر کی حکومت پر شدید تنقید کی ہے تو انہوں نے برطانوی حکومت کے اہل کاروں کے ظلم، تعصب اور عدل سے انحراف کو بھی بڑی جراءت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ **سرسید کو انگریز پرست کہنے کے لئے بے انصافی کے ساتھ ساتھ جہل کی ضرورت بھی ہے۔** یہ وہ مرد جلیل تھا جو اپنے افسران بالا سے اجازت لئے بغیر دربار بنارس سے رخصت ہو گیا تھا، کیونکہ وہاں انگریز اور ہندوستانی حکام کی نشستوں کے سلسلہ میں تفریق برتی گئی تھی۔

تو، آپ نے ملاحظہ فرما لیں وہ تحریریں جو وہی قلم لکھ سکتا تھا جس نے اسبابِ بغاتِ ہند لکھی۔ مندرجہ بالا تحریریں جو آپ کو پسند آئی ہوں، ایک بار پھر پڑھیں اور ۵۷ء کے باغی پر رحمت کی دعائیں برسائیں۔ (ش)

علی گڑھ کے شعر و ادب کی سب سے بڑی پہچان

## خلیل الرحمٰن اعظمی

کا سب سے زبردست شعر

**تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے**
**مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے**

# مرشدِ اولیں کی یاد میں

آیئے عرض گزاریں کہ (صلاح الدین محمود کی زبان مستعار لیتے ہوئے) مرشد کی وفات کو ابھی پانچ اوپر پینتیس سال گزرے تھے کہ ہمیں اس عالم رنگ و بو سے ملاقات ہوگئی، ابھی ابوالکلام بھی زندہ تھے، حسرت موہانی، اور ذاکر حسین بھی، سیدین بھی : ان سب کی آنکھیں دیکھیں بلکہ اقبال بھی زندہ تھے، (مگر اقبال کی وفات کے وقت میں ابھی شعوری عمر میں داخل نہیں ہوا تھا)، میں نے شعور سنبھالا تو سید سے نہ سہی ان کے دھڑکتے ہوئے دل، علی گڑھ سے ملاقات ہوئی تو 20 برس کے قریب مزید گزر چکے تھے، وہاں علی گڑھ کے وہ سب مذکورہ نامور فرزند مل گئے، اور ایسے ملے کہ: پھر کہیں کا نہ چھوڑا :

اک دن وہ مل گئے سرِ رہ گزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

پھر یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ ہزار میل دور خدا بخش کی چشم نگراں نے blessings دیں، ان کے ادارے سے تو سر سید کی تفسیر چھپی، اصول تفسیر بھی (اسبابِ بغاوت ہند بھی؛ بلکہ سید کے 'مخدوم' حالی کی مسدس بھی، اور سید کا شغف اولیں **مفاہمہ بین المذاہب**، کی بھی نیو پڑ گئی تھی) مگر سید کے افکار خود سید کے علی گڑھ میں اچھوت ہی سمجھے جاتے رہے۔

●

سر سید کی ''اسباب بغاوت ہند/ Causes of Indian Revolt'' کئی لحاظ سے ہندستانی دانشوری کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں بھی کہ اس نے 1857ء کے بعد کے کڑے دور میں ہندستانی قوم کو بالعموم اور ہندستانی مسلمانوں کو بالخصوص rehabilitate کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد بھی سر سید نے جتنے کام کیے، سب کے سب اسی ایک علامتی لفظ rehabilitation کی کوشش کے گرد گھومتے رہے ہیں، بس نام اور موضوع بدلتے رہے۔

1857ء کے بعد سر سید کی بصیرت نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ سات سمندر پار سے آنے والی قوم سے یا تو لڑنا ہوگا یا ساتھ رہنا ہوگا؛ اور دونوں صورتوں میں خود ان کو سمجھنا، اور اپنی قوم کے بارے میں انھیں سمجھانا ضروری بلکہ ناگزیر ہے/تھا۔

آج، کیا سر سید کی اس بصیرت کی تکرار کی ضرورت نہیں ہے؟ مسئلہ جوں کا توں ہے صرف فریق بدل گئے ہیں۔

● تو، جناب، کبھی اس باغی سر سید سے بھی ملیے (مصنف اسبابِ بغاوتِ ہند) جس کی اس کتاب کی اشاعت پر کئی وکٹوریہ پرست انگریزوں نے اسے تاج برطانیہ کا سب سے خطرناک دشمن قرار دیا تھا اور اس پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔

چاروں طرف پھیلے انگریزی استبداد کے ظلم و ستم اور جابریت کے بیچوں بیچ رہ کر اس کتابچہ نے جرأت مندی اور بے خوفی کا وہ بے مثال مظاہرہ کیا جو ایسے بھیانک وقت میں کسی ہندستانی سے کسی طور بھی ممکن نہ تھا۔ معاصر تحریروں میں شاید کوئی اور مثال ملے بھی نہیں۔ اس کتابچہ میں تاجِ برطانیہ کا وفادار سر سید نہیں ملتا، باغی سر سید سے ملاقات ہوتی ہے ہماری! جب ہی تو، حالی کے بقول، اس وقت کے فارین سکریٹری (انگلستان کے وزیر خارجہ) نے ''ان کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسبِ ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے، اور کوئی معقول جواب نہ دے تو سخت سزا دینی چاہیے''۔

تیس چالیس سال بعد، پیچھے مڑ کے دیکھتے ہوئے تھیوڈور ماریسن نے لکھا کہ: ''انگریزوں میں بہت سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ فتح کے بعد دل کھول کر انتقام لیں۔ اور ان کے غصہ کی آگ مسلمانوں کے برخلاف خاص کر بھڑکی ہوئی تھی جن کی نسبت بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں، اس وحشیانہ حالت میں جب کہ شدید تر حالات پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی حق بات کا جو عام پسند نہ تھی منھ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی......''۔

تاریخِ سیاسیاتِ ہند اور تاریخ جدوجہد آزادی کا یہ ایک سنہرا باب صرف سر سید نے لکھا، اور وطن عزیز کے لئے اپنی جان اور عزت کو داؤں پر لگا کر لکھا کہ ''اصل سبب فساد کا میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں: ...... شریک نہ ہونا ہندوستانیوں کا لیجسلیٹو کونسل میں!...... باقی جس قدر اسباب ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں''۔

ماریسن نے اسے پڑھنے کے بعد ایک بار پھر لکھا:

''1858ء میں یہ دلیری کے الفاظ تھے! باوجود اس کے...... جو لوگ سر سید کے اس برتاؤ پر جو نیشنل کانگریس کے ساتھ کیا، الزام لگاتے ہیں، ان کے لئے اس بات پر غور کرنا مفید ہوگا کہ اس نے اتنی مدت پہلے، جتنی کہ 58ء سے اب تک [1898 = سالِ وفات سید] گزری، گورنمنٹ پر زور ڈالا تھا کہ لیجسلیٹو کونسل میں دیسیوں کے داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے''۔

برمنگھم کے ڈیلی گزٹ کا یہ تبصرہ بھی لائق توجہ ہے کہ ''[سر سید کی بیان کردہ] شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا کہ ہندستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ سے متعلق کی گئی...... اور ہندستانی جو ملازم سرکار نہ تھے وہ وائسرائے اور پریزیڈنسیوں کی لیجسلیٹیو کونسلوں میں شریک کیے گئے''۔ سینٹ جیمس بجٹ نے لکھا کہ ''سید احمد کی وہ خواہش جو ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی تھی، پوری ہوئی، لیکن ابھی اس کی شکایت میں زور ہے''۔ یہ سب نقل کرکے حالی نے کچھ تفصیل بھی دی کہ ''1860ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا، اور 1861ء میں، لیجسلیٹیو **ہندستانی**......کونسل کی ممبری پر نامزد کئے گئے۔ چنانچہ جنوری 1862ء کے اجلاس کونسل میں ہم پہلی بار مہاراجہ نریندر سنگھ رئیس پٹیالہ، راجہ دیو نرائن سنگھ رئیس بنارس اور راجہ ڈنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار کو شریک پاتے ہیں اور اگرچہ اس وقت ہندستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا، مگر سر سید نے درحقیقت یہ بیج بویا تھا اس پودے کا، جواب کس قدر بارآور ہونے لگا ہے اور ان کا یہ احسان پورے ملک پر رہے گا...... کتاب مذکور (اسباب بغاوت ہند) میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں پر نہیں مقرر کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی 1862ء میں پہلی بار پنڈت شمبھوناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوتے تھے، ملنے لگے''۔

سرسید کی یہ تنہا اتنی بڑی خدمت تھی کہ ہمارے **پولیٹیکل** سائنٹسٹ اس کتاب کو 19 ویں صدی کے سیاسی افکار اور عملی سیاسیات دونوں کا سنگ میل قرار دیتے! مگر خود ہمارے **اپنے** کم اندیش دانشور اور **ادھ کچرے سیکولر**، دوسروں کو متوجہ نہ کر سکے تو غیروں کو کیا کہیں! بس ایک رٹ ہے جو لگی ہے تو لگے جا رہی ہے کہ سرسید اینٹی کانگریس تھے، اس لیے اینٹی نیشنل ہوئے۔ کم سوادوں کو نہ تو اپنے آپ کو 19 ویں صدی میں پہنچانے کے عمل سے گزارنا آتا ہے، اور نہ اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ کبھی کبھی منزل تک پہنچے کے ایک سے زیادہ راستے بھی ہوا کرتے ہیں؛ اور یہ کہ خاص کر مسلمانوں (باغیوں) پر پڑے اس کڑے وقت میں قوم پرستی کا تنہا نام [انڈین نیشنل کانگریس] ہی تو نہیں تھا۔

سید کے اس زمانہ کے اسٹینڈ (موقف) کی بنیادی اہمیت اور ہمارے لحاظ سے آج کے ہندوستان میں اس کی معنویت کی طرف سینٹ جیمس بجٹ نے جس خوبصورتی سے اشارہ کیا تھا، حالی نے اسے اس طرح اردو میں ڈھالا تھا: ''ابھی سرسید کی اس شکایت میں زور ہے کہ ...... **دونوں، طرفداری** اور غلط فہمی ہونے کے سبب، ہنوز ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اور **یہ اکثر** صورتوں میں عدم ہمدردی یا بالاتر قوم کی طرف سے عمدہ اخلاق نہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے...... سرسید نے خاص کر ایسے خیالات پر زور دیا تھا کہ جو بات دونوں کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات اور حالات کو بخوبی سمجھیں۔ سرسید نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ زیادہ تر واقعات کی بنیاد...... بجائے ناراضی کے غلط فہمی تھی، پس اگر ایک دوسرے کے خیالات سمجھنے میں ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کریں گے تو ان کے باہمی تعلقات بہت زیادہ مربوط و مستحکم ہوجائیں گے۔ انھیں خیالات سے ہندوستان کے مسائل حل ہوں گے اور انھیں کی دوسری صورت ہے علی گڑھ کالج'' : کل بھی اور آج بھی!

اگر اوس وقت کے **'دونوں'** میں افہام و تفہیم کی ضرورت تھی (اور اس کے لئے ایک علی گڑھ کالج قائم ہوا) تو کیا 'آج کے دونوں' میں افہام و تفہیم، اوس وقت سے بھی زیادہ ضروری نہیں ہے؟ مت کہیے مجھ سے کہ آج تو ہم آزاد سیکولر جمہوریہ کے برابر کے شہری ہیں، اور قوم کی تقدیر سازی میں برابر کے شریک! یہ سب درست؛ لیکن جب کوئی decision یا فیصلہ لینے کا لمحہ آتا ہے تو یہ سب کا سب دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے!! سبب وہی ہے جو اوپر کے اقتباسات میں سرسید نے بہ زبانِ دیگر بیان کی ہے: یعنی دونوں نے ایک دوسرے کو قریب سے سمجھا ہی نہیں؛ اب تک!

•

سرسید کا ایک مشن تھا: دو قوموں، دو مذہبوں، دو تہذیبوں میں بڑھتے ہوئے فاصلوں کو قربت میں بدل دینا، ان کی دوصد سالہ یاد منانے اور یادگاریں قائم کرنے کے ذیل میں یہ بات بھی طے ہوئی کہ **بین المذاہب مفاہمہ** کے لئے جا بجا مرکز قائم کیے جائیں: علی گڑھ سے ایک المنای شروعات ہوئی، پھر یونیورسٹی نے بھی ایک مرکز وظیفۂ لب کے طور سے قائم کر دیا۔ کشمیر، مالا پورم، ہمدرد، اور جامعہ کے مراکز بھی امید ہے جلد ہی قائم ہوتے جائیں گے، **مفاہمہ مرکز** کی طرف سے زور اس پر رہا کہ :

مذہب تو سب سچے ہیں اور اچھے ہیں، مگر میرا مذہب میرے لئے اور تمہارا مذہب تمہارے لئے! بات آگے بڑھتی ہے کہ میرا مذہب میرے لئے سب سے اچھا اور سب سے سچا؛ کسی بھی دوسرے کا مذہب اس کے لئے سب سے اچھا سب سے سچا! بات اور آگے بڑھتی ہے کہ ع جہاں باز و سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے! یعنی میرا مذہب **ہی** سب سے سچا ہے اور سب سے اچھا ہے! بات پھر اور آگے بڑھتی ہے کہ : تو، دوسرے مذہب والوں کو چاہیے کہ وہ اپنا اپنا مذہب چھوڑ کر میرے مذہب میں جوق در جوق داخل ہوں کیوں کہ وہ سب ٹھہرے جھوٹے مذہب والے، بس میں ہوں سچے مذہب والا !

یہ جو آویزشوں کا سلسلہ چلا، اور آدمی جانور بننے لگا، تو خیال آیا پہل تو ایسے ہی کرنی ہوگی کہ ایک دوسرے کو سمجھا جائے؛ اور، ہر دوسرے کے مذہب کو عزت دیتے ہوئے سمجھا جائے۔

اس کے لئے علی گڑھ نے ہندو مذہب پر سب سے پہلے ایک بنیادی دستاویز چھاپی بعنوان ''مرکز برائے مفاہمہ بین المذاہب''۔ پھر **اسلام کے تعارف** میں ایک کتاب شائع کی: ''اسلام کیا ہے'' (از ابو الفضل م 1947ء)۔ اب سمجھنے سمجھانے کی بات بڑے پیمانے پر شروع ہو چکی تھی، **مسلم یونیورسٹی میں ہندو مخطوطات** پر ایک بڑا اہم ذخیرہ ہے، سب سنسکرت صحائف یا ان کے متعلقات کے قدیم فارسی تراجم ہیں، انھیں انگریزی اردو میں متعارف کرا دیا گیا۔

پھر جم کے کچھ کام ہوا کہ ہندو دھرم اور اسلام پر سیاست کاروں نے جو کالکھ پوت دی ہے، اسے صاف کر کے نکھار کے، اصل ہندوازم، اصل اسلام کو بھی دیکھنے کی فرصت نکالی جائے، کوشش کی جائے کہ انسانیت جو کبھی دین (اسلام) کبھی دھرم کے نام سے زندہ تھی، انھیں بھی سانس لینے کی گنجائش نکالی جائے۔ اس ذیل میں سید جشن کے موقع سے جو قیمتی تحریریں شائع ہوئیں ان کا ذکر اپنی جگہ پر آچکا، (پنڈت سندر لال، مولانا مناظر حسن گیلانی، بشمبھر ناتھ پانڈے وغیرہ) کیا ایسے میں جب گھٹا ٹوپ بادلوں نے چاروں اندھیرا چھا دیا ہو، کیا لکھنے لکھانے سے کوئی فرق پڑتا ہے؟ خاص طور سے جب سیاست کار بازی مار گئے ہوں اور دانشور اپنے اپنے گھونسلوں میں دبک کر بیٹھ گئے ہوں؟ کرنا تو کچھ ہوگا، جتنی جس کی سکت ہو، بس ایسے میں یاد اس عظیم دانشور ہی کی آتی ہے جس نے کہا تھا: اندھیرے جتنے بھی گھنگھور ہوجائیں ایسے میں ایک ننھی سی شمع جلا ڈالو جسے ساری دنیا کے اندھیرے مل کر بجھانے کی طاقت نہیں رکھتے؛ نہیں بجھا سکتے اس لئے کہ شمع تو روشنی ہی دے گی اندھیروں میں اتنی سکت ہی کہاں کہ ننھی سی شمع کو بھی بجھا دیں۔ **(ع رب)**

☆☆☆

آزادی کے بعد

علی گڑھ نے

اردو شاعر کو ایک اور بڑا شعر بھی دیا:

**کچھ تو ہو جس کے فیض سے دل کو ہو تاب و تب بہم**

**کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم**

(خورشید الاسلام)

# سید حامد: قلم سے قدم تک

از ڈاکٹر راحت ابرار (ڈائریکٹر، اردو اکادمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

سید حامد کا 94 سال کی عمر میں 29 دسمبر 2014 کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ سید حامد صاحب 1937 سے 1942 تک پانچ سال مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہے۔ ایم اے فارسی اور ایم اے انگریزی کی اسناد حاصل کیں۔

1980 سے 1985 تک انہیں اپنی مادرِ علمی کی خدمات انجام دینے کا موقع ملا اور وائس چانسلر کی حیثیت سے انہوں نے علی گڑھ تحریک کے احیاء کی سرگرم کوششیں کیں، سرسید کے ''تہذیب الاخلاق'' کو دوبارہ جاری کیا اور اس طرح سرسید کے مشن اور وژن سے متعلق نئی نسل کو سرسید کے کارناموں سے متعارف کرانے کی کوشش کی۔

سید حامد صاحب سے راقم کی ملاقات سب سے پہلے 1974 میں ہوئی جب مسلم یونیورسٹی کی طلبہ یونین کے صدر جناب ظفر الدین خاں فیضان نے یونین ہال میں ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا تھا، جس کا موضوع تھا ''کیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اردو کر دیا جائے'' بی اے کے طالب علم کی حیثیت سے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اس طرح کی تجویز سے نہ صرف مسلم یونیورسٹی کا بین الاقوامی کردار اور کل ہند کردار ختم ہوجائے گا بلکہ مسلم نوجوانوں کے لئے روزگار کے دروازے بھی بند ہوجائیں گے۔ میری اس رائے کی سید حامد صاحب نے بھرپور حمایت کی۔ جس وقت یہ مذاکرہ منعقد کیا گیا تھا اس وقت بھی صوبۂ اتر پردیش میں اردو زبان و تدریس کے خلاف احتجاجی مہم پورے شباب پر تھی، اور ایک نعرہ ''اردو اگر تھوپی گئی لڑکوں پر تو خون بہے گا سڑکوں پر'' شباب پر تھا اور صوبہ میں لسانی تعصب کی آندھی زور و شور کے ساتھ چل رہی تھی۔

یوپی رابطہ کمیٹی، علی گڑھ کے زیرِ اہتمام پہلا ریاستی تعلیمی کارواں 10 اپریل 1991 تک نکالا گیا۔ اس ریاستی تعلیمی کارواں کی شاندار کامیابی کے بعد ''کل ہند تعلیمی کاراں 8 سے 24 دسمبر 1995 تک نکالا گیا۔ کل ہند تعلیمی کارواں کی اس روئداد کو ''کل ہند تعلیمی کارواں'' کے عنوان سے ایک کتابی شکل میں مرتب کرنے کا فریضہ میرے سپرد کیا گیا۔ اس دوران سید حامد صاحب کی شخصیت کو سمجھنے، پرکھنے اور ان کی انتظامی اور علمی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کا موقعہ ملا۔

سید حامد صاحب نے ملک بھر کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کو عام کرنے کے لئے جس طرح اس کارواں کی قیادت فرمائی تھی اور ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں کو ان کی تعلیمی ضرورتوں کا احساس دلایا تھا، بالکل اسی طرح بانی درس گاہ سرسید احمد خاں نے بھی 1886 سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ، جا بجا جلسے کرکے، تقریریں کرکے ایک ڈیڑھ صدی قبل جو کام (سرسید نے) شروع کیا تھا، اس سے روشنی حاصل کرتے ہوئے علی گڑھ تحریک کے احیاء کے لئے سید حامد صاحب نے کیا اور انہیں ''سرسید ثانی'' کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔

یہ تعلیمی کارواں 8 دسمبر 1995 کو جمعہ کے دن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد میں نماز اور سرسید کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد اسٹریچی ہال میں منعقدہ ایک افتتاحی جلسہ سے شروع ہوکر 25 دسمبر 1995 کو اپنے اختتام کو پہنچا جس کا بنیادی مقصد تعلیم، اصلاحِ معاشرہ، حفظانِ صحت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا پیغام تھا۔ یہ مسلمانوں کے لئے ''کاروانِ حیات'' تھا جو تعلیم کے ساتھ آگہی کا پیغام دے رہا تھا، اور مختلف اداروں اور تنظیموں کو ایک کڑی میں پرونے کا بنیادی فریضہ انجام دے رہا تھا۔ ان اداروں اور تنظیموں کے درمیان نیٹ ورک کی یہ پہلی کوشش تھی۔

تعلیمی کارواں کے قائد کے طور پر سید حامد صاحب نے بعض جگہ چھوٹے چھوٹے اسکولوں اور مدرسوں میں چٹائی پر لیٹ کر رات گزاری اور رات میں وہ بس میں سفر کے دوران سیٹوں کے درمیانی جگہ میں بستر ڈال کر رات گزارتے تھے۔ وہ علمی قائد اور دردمند انسان کے طور پر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

●

## منصور آغا کی کتاب

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مایہ ناز فرزند و سابق وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد کے چانسلر اور آزاد ہندستان میں مسلم تعلیمی اداروں کے قیام کے محرک جناب سید حامد کی شخصیت اور ملک و ملت کے لئے ان کی گراں قدر خدمات پر ممتاز صحافی، متعدد کتابوں کے مصنف اور مرتب جناب سید منصور آغا کی مرتب کردہ چھ ابواب پر مشتملا یک جامع کتاب ''پیکرِ عمل: سید حامد'' ایک علمی خراجِ عقیدت ہے۔ جس میں سید حامد صاحب کے نظریۂ تعلیم کے علاوہ ان کے اپنے مضامین، مقالات اور خطبات کے ساتھ ساتھ سید حامد شناسوں کے مضامین کو سید حامد کی شخصیت اربابِ علم و دانش کی نظر میں'' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ 456 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو قومی کاؤنسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ کتاب کی قیمت 210 روپیہ ہے۔

جناب منصور آغا خود بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم ہیں اور یہاں سے انہوں نے ایم اے (سیاسیات) کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انہوں نے کثیر الجہت شخصیت کے مالک سید حامد کے انتقال کے بعد اپنی والہانہ عقیدت کی بناء پر یہ کتاب مرتب کی ہے، جس کے لئے وہ خاص طور پر علی گڑھ برادری کی طرف سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔

● جناب منصور آغا صاحب نے باب پانچ میں ''کارواں: سید حامد کی جدت'' کے عنوان سے سات مضامین کو شامل کیا ہے۔ کاش وہ یوپی رابطہ کمیٹی کی طرف سے میری کتاب میں سید حامد صاحب کا جو ''پیش لفظ'' ہے اس کو بھی شامل کر دیتے تو کارواں کے مقاصد اور بہتر طور پر منظرِ عام پر آجاتے۔

اس کتاب میں مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ، جامعہ ہمدرد کے سابق وائس چانسلر جناب سراج حسین اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سبق وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراجپوری، مسلم یونیورسٹی کے سابق پرووائس چانسلر بریگیڈیر سید احمد علی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق پرووائس چانسلر خواجہ محمد شاہد کے مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ کے اساتذہ میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر سعود عالم قاسمی، ، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی اور راقم الحروف کے مضامین بھی شامل ہیں، جو کسی نہ کسی طور پر سید حامد صاحب سے وابستہ رہ چکے ہیں۔

غرض کہ سید منصور آغا صاحب نے سید حامد صاحب پر اردو اور انگریزی زبان میں کتابیں تصنیف کرکے ایک بڑا کام کیا ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ جس طرح خواجہ الطاف حسین حالؔی نے سرسید احمد خاں پر ''حیاتِ جاوید'' تصنیف کی، اسی طرح سرسید ثانی سید حامد پر منصور آغا کی کتاب کو بھی علمی حیثیت حاصل ہوگی، اور اس کتاب کی حوالہ جاتی حیثیت متعین ہوگی اور جو لوگ سید حامد پر یا علی گڑھ پر کام کر رہے ہیں، ان کے لئے بہترین مواد کی فراہمی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

ایک خاص بات اور: اس کتاب میں تہذیب الاخلاق میں شائع 1982 سے 2014 تک سید حامد صاحب کے 213 مضامین کا اشاریہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ غالباً ''تہذیب الاخلاق'' میں ان کے سب سے زیادہ مضامین شائع ہوئے ہیں۔

☆☆☆

# THE POWER-PLAY TO CONTROL THE AFFAIRS OF THE M.A.O. COLLEGE, ALIGARH

*Latest Masterpiece of Prof. Iftikhar Alam Khan*

- *by* Dr. Sajjad (AMU)

In the academic researches, socio-political histories of the educational institutions of India are relatively less attended subject. David Lelyveld's *Aligarh's First Generation* (1978) is among outstanding exceptions. The range of sources Lelyveld has delved into, deep insights he offers and numerous aspects he suggested to be explored further, remain guiding lights for the researchers. Prof. Iftikhar Alam Khan (born 1938) is one of the rare scholars to have derived immense benefits from Lelyveld and his works.

During 1998-2001, he served as Honorary Director, Sir Syed Academy, AMU, Aligarh. Despite being a science-academic, he looked into the archival documents and he is continuously coming out with outstanding works on the life and times of Sir Syed, his companions, his institutions, his private and public lives. Prof. Iftikhar's engagement with primary sources, analytical abilities, and marvelous lucid Urdu prose is just admirable. He is able to capture the vivid, picturesque details and mood of the era he writes about. He dishes out orthodox historiographic rigours in terms of conducting meticulous historical research and articulates with enviable flavour of semi-creative literature.

His latest Urdu language book, *Rufaqa-e-Sir Syed: Rafaqat, Raqabat wa Iqtidar Ki Kashmakash*, under review, is his 13th book in the theme/series of Sir Syed and his movement.

Apparently, this slim volume comprises of the profiles of Sir Syed's three companions, viz., Samiullah (1834-1908), Mehdi Hasan Mohsin-ul-Mulk (1837-1907) and Mushtaq Husain Viqar-ul-Mulk (1841-1917). But there is much more to it. These profiles have to do with the contradictory worldviews of Sir Syed's companions, layers of their commitments to and engagement with colonial modernity, psycho-analysis of their personality traits, their power-play and intrigues, mutual jealousies, brighter and darker aspects of their conduct and intent, particularly in the affairs of the MAO College, and various other aspects of their personalities. This volume brings out that all three had significant discords with Sir Syed, yet, Sir Syed had a remarkably worth emulating leadership quality of taking all such people along, towards accomplishing his project of the residential college of modern education.

The complex and lesser known aspects of the struggle of power to control the MAO College have been brought out very well. Nothing has been said without evidence and also a commentary on the credence of the evidence. In doing so, the author brings out the limits of colonial modernity, the limitations of the reformists, and overlaps with and contradictions between the modernity and tradition. Human weaknesses and frailties of these leaders have also been brought out un-inhibitively. He has used hitherto unused archival documents, private and official correspondences, memoirs, and several other evidence without losing sight of the class character, regional specificity and overall colonial context of the whole story.

One of the most revealing discoveries of the author is to expose the smear campaigns launched against sir Syed's son (and successor as Secretary of the College), Syed Mahmood (1850-1903) by these three people, often in connivance with the European elements of the College. Deriving benefits out of some temperamental weaknesses and eccentricities of Syed Mahmood, these people, ousted him to get hold of the College affairs. This had particularly deleterious impact upon the personality and conduct of Syed Mahmood, during last few years of his tragic life. An all encompassing biography of Syed Mahmood, as also of Sir Syed, still remains awaited. However, a doctoral dissertation (Mc Gill University, 2004) of Alan M Guenther, "Syed Mahmood and the Transformation of Muslim Law in British India" carries a good and long chapter on his biography. This chapter and Guenther's 2011 essay on Mahmood's writings on English education in India, largely fill this gap. Prof. Iftikhar however goes beyond that and exposes the malicious propaganda and smear campaign that was launched against Mahmood to oust him from the management of the MAO College. Just to denigrate Mahmood, Mohsin-ul-Mulk manufactured and spread a rumour that Mahmood didn't bear the expense of the last rites (*takfeen wa tadfeen*) of his father in March 1898, and that the expense was borne by Mohsin-ul-Mulk. Prof. Iftikhar not only debunks it by demonstrating that Mahmood paid much bigger expense of the medical treatment of his father. Iftikhar further pricks commonsense of his readers that a big sum of Rs 50/-

was absolutely not required for the purpose, at that point of time. He then asks, even if, for a moment, one persuades oneself to trust this version of Mohsin-ul-Mulk that he funded the last rites of Sir Syed, does it behove any decent and dignified person to have brought this act of self-professed philanthropy in public domain?

Mohsin-ul-Mulk, more manipulative, cunning and unscrupulous in power-play (not in financial affairs of the College) than the other two, played a particularly damaging role in prioritizing politics over core educational concerns of the College. He indulged in power-politics, aligned with the British, played a pivotal role in the Shimla Deputation, where, in their charter of 10 odd main demands, the demand of raising the College to a residential university with a power of affiliating jurisdiction across the subcontinent was sadly brought down to the last point. This mis-prioritization had, and continues to have, serious repercussions on the entire sub-continent. In short, immediacy and haste of seeking share in political power became a greater concern of the Muslim landed aristocracy and the "Kutcherry class" of the specific parts of western Uttar Pradesh, metaphorically identified with, Aligarh, Bulandshahr and Moradabad. Many of the Muslim elites of this specific sub-region and its vicinities had an ambivalent and love-hate relationship with the modernist project of the College and simultaneously they were also trying to retain traditional retrogression. This was unlike the clear-headed goal of Sir Syed who wanted a best fusion of East and West. This is why, Prof. Iftikhar is now working on the traits of the Muslim elites of this sub-region. Proposed title of his forthcoming book is, "Atraaf-e-Sir Syed", the vicinities in which Sir Syed worked and lived.

Though, the author leaves his readers tempted to know the roles of the three companions cum successors of Sir Syed in the Educational Conference, which was regrettably turned into a political organization rather than an educational movement. As a sad result, after Sir Syed's death, not a single residential college could be set up elsewhere in the country. Only significant addition to the credit of the Educational Conference was setting up of the Women's College. This is in sharp contrast with the Anjuman-i-Islam of Mumbai, which endures with a chain of schools and colleges across western India. This specific aspect of history of the Educational Conference still awaits deeper explorations and evaluation.

Syed Mahmood was particularly peeved at this mis-prioritization and deviation from the originally set goal of the College and the Movement. By the 1880s, argues the author, Sir Syed's stature had gone high. Hence, his close companions were guarded and restrained in dissenting (beyond a limit) against Sir Syed's stated vision about his college. Of all his companions, his vision was holistically shared and subscribed only by his son, Syed Mahmood. But Mahmood was not acceptable as Secretary of the College, by the three worthies studied by Prof. Iftikhar, who brings out the details of the power-play hatched against Mahmood after Sir Syed passed away in 1898, and by 1900, Mahmood was ousted not only from the College management but also from Aligarh. He had to shift to Sitapur to stay with his second cousin.

According to the author, Mushtaq Husain Viqar-ul-Mulk was more conservative and traditionalist of the three, but was more scrupulous, honest (with an arrogance of honesty and integrity) than the other two. Sir Saiyad wrote of Viqar-ul-Mulk, "I believe that Mushtaq Hussain would not change his opinion even if God revealed Himself against it" (Francis Robinson, *Separatism Among Indian Muslims: Politics of the United Provinces, 8160-1923.* Pp. 399-400. Cambridge, 1974).

Despite being a traditionalist and devout Muslim and more conservative, in fact reactionary, in terms of caste and gender, Viqar-ul-Mulk's conduct with his widowed British daughter in law, Shelly, was extremely dignified. This aspect is dealt with by Prof. Iftikhar in detail. Earlier, Naved Masood, in one of his blogs, "Humanism of an Ultraconservative", had brought out this anecdote more clearly. Masood then comments,

"We need not question the judgment of Sir Syed [about Viqar-ul-Mulk] but take note of the multi-layered nature of human personality. At an altogether different plain, the facts mentioned here invite the serious scholar to examine the human side of 'Muslim orthodoxy' and whether it holds certain lessons- or at least provides 'points to ponder'- for the current, self-righteous orthodoxies with their rigid worldviews. In any case, the episode deserves to be widely publicized as providing new insights in the social life of the Muslim gentry".

Notwithstanding some proof-errors, and little bit of repetitions glossed over by the publication-editor, this needs an added appreciation that even in this era of an embattled and marginalized Urdu language, such rigorous academic studies are being published in that language. A short concluding note towards the end of the book may have enhanced the value of this wonderful book.

English language academia of humanities and social sciences need to learn much from the rigours of meticulous research that is embellishing the book under review. This is a very significant addition in the existing literature on the history of the Aligarh Movement and of the colonial north Indian Muslim elites, besides inviting the attention of historians to explore social histories of other major educational institutions in India. One hopes, such valuable accounts shall be soon rendered into English for even wider readership.

.

***